لیکن جب اسلام اور مسلمانوں کی بات آتی ہے، تو دینا بھر کا تعصب ان کے حلق سے اگلنے لگتا ہے۔ اور اسلامی شعائر کو جلانے کے لیے ان کی آنکھوں سے شعلے برآمد ہونے لگتے ہیں۔ معاملہ اگر ہندومت، عیسائیت، یہودیت یا قادیانیت سمیت دنیا کے کسی بھی مذہب کا ہو، ان سیکولر لوگوں کی برداشت، ان کی محبت اور پیار کے جام بھر جاتے ہیں اور الفت وشادمانی کی صراحیاں چھلکنے لگتی ہیں؛ لیکن مسلمانوں اور اسلام کے معاملے میں ان کے دوہرے پیمانوں کی سند حضرتِ شعیب علیہ السلام کی ہلاکت زدہ قوم سے جاملتی ہے۔

ترکی کی قیادت اس لحاظ سے قابلِ ستائش ہے کہ مشکل کی اس گھڑی میں ان کے ہاتھ پاؤں پھول نہیں گئے۔ انہوں نے بروقت اور درست فیصلہ کیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ فوجی بغاوتوں کے وقت بزدل، بدعنوان اور غدار قیادت ملک سے فرار ہو جاتی ہے، غیروں کے ہاں پناہ لیتی ہے اور ان ہی قوموں میں جا کر آباد ہو جاتی ہے، جن کے مفادات کا تحفظ وہ اپنے دورِ اقتدار میں کرتے رہتے ہیں۔ فوجی بغاوت تو درکنار، کسی بھی بغاوت کی افواہ ہی اڑنے لگے، تو ان کا جہاز وطن کی حدود سے باہر جھانک رہا ہوتا ہے؛ اور جب تک ضمانتیں اور تسلیاں نہ دی جائیں انہیں واپسی درپیش نہیں ہوتی۔

ان نازک حالات میں ترکی کی محبّ وطن قیادت ملک سے باہر ہونے کے باوجود فوراً اپنے وطن پہنچ گئی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق افواج کے سپہ سالارِ اعظم کو سیکولر باغیوں نے کہیں نظر بند کر رکھا تھا، اس صورتحال میں فوری طور پر ایک قائم مقام سپہ سالار کی تعیناتی عمل میں لائی گئی، اس نئے سپہ سالار نے بڑی چابکدستی سے اپنی عسکری استعداد کے بل پر باغیوں کو قابو کیا اور بغاوت کو بقوت وبزورِ بازو کچل کر رکھ دیا۔ ملک کی سیاسی قیادت نے عسکری کمان کو شاباش دی، اور انہیں حالات کو سنبھال لینے پر آفرین کہا۔ سیکولر اور اسلامی قوتوں کا یہ ٹکراؤ پوری اسلامی دنیا کے لیے مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ ترکی کی اسلام دوست حکومت باقی رہے گی اور اس واقعے کے بعد ترکی کی اسلام پسند قوتیں اپنے اعتمادِ نفسی میں قوی تر ہو کر بھرپور تاریخی کردار ادا کریں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

[بشکریہ: ماہنامہ ظلال القرآن، اگست 2016ء]

حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ اور فرعون

ابوعبداللہ

قرآن کریم، بائبل اور تالمود کے مابین ایک یورپی، انصاف پسند محقق کا تقابلی جائزہ اور قرآن کریم کا علمی، تاریخی اعجاز، جس میں قصہ یوسف علیہ السلام کے حوالے سے محقق جیمز واٹ نے نہ صرف خود تسلیم کرتا ہے؛ بلکہ وہ قرآنی حقیقت اور سچے بیان کو اپنے ساتھیوں اور علماء پر بھی پیش کرتا ہے۔ بالآخروہ اور فادر آکسٹن اسی بنیاد پر دین اسلام قبول کرتے ہیں۔ جبکہ یونیورسٹی ان کی ڈین ودیگر مدعیانِ روشن خیالی قرآن کریم کی واضح حقانیت کے باجود آنکھیں موند لیتے ہیں۔ ضد وہٹ دھرمی اور قبول حق کے حوالے سے ایک زندہ تحریر جو یقیناً حق کے متلاشی غیر مسلم قارئین کے لیے سرمہ چشم ثابت ہوگی(ادارہ)

میرا نام جیمز واٹ ہے۔ تاریخ میرا پسندیدہ موضوع ہے اور مصری تاریخ خاص طور پر میری دلچسپی کا مرکز رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاید ہی دنیا کی کوئی اور تاریخ اس قدر پراسرار، عظیم الشان، دلچسپ اور ہمہ رنگ ہو جس قدر مصر کی تاریخ ہے۔ چنانچہ اس ضمن مین مصر کے اس دور کا مطالعہ کر رہا تھا جس میں ان پر باہر سے آئی ہوئی قوموں نے حکومت کی۔ اس طرح کا ایک دور ۱۷۲۰ سے ۱۵۶۷ قبل از مسیح کا تھا۔ اس دور کے بارے میں دلچسپ بازت یہ معلوم ہوئی کہ مصریوں نے اسے اپنی تاریخ میں کوئی جگہ نہیں دی۔ حالانکہ امن وامان اور خوشحال کے لحاظ سے یہ سنہرا دور تھا۔

جب میں نے اس دور کے حوالے سے پوری تحقیق کی تو معلوم ہوا اس دور کے حکمرانون کو مصری HYXSOS یعنی چرواہا خاندان کہتے ہیں۔ دراصل یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور یہ تجارت کے لیے مصر میں آتے رہتے تھے۔ ۱۷۲۰ ق م کے قریب جب مصر کے مقامی حکمرانوں کی حکومت پر گرفت کمزور پڑی تو ان کے بعض جنگجو قبائل نے یہاں قسمت آزمائی کی اور مختصر جنگوں کے بعد یہ مصر کے حکمران بن گئے۔ یہ لوگ چونکہ بھیڑ بکریاں اور دوسرے جانور پالتے تھے۔ اور اسی پر ان کی معاش کا زیادہ تر دارومدار تھا، اس لیے انہیں "چرواہا" کہا جاتا تھا۔ دراصل مصری میں HYK کا مطلب ہے چرواہا یا چرواہا بادشاہ۔ اسی خاندان کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس خاندان کے دور حکومت میں مصر میں غلام بنا کر لائے گئے اور پھر وہ عزیز مصر کے عہدے پر پہنچ کر عملاً مصر کے حکمران بن گئے۔

اس بات کے معلوم ہو جانے کے بعد مجھے میرے اس سوال کا جواب مل گیا کہ مصریوں نے تاریخ کے اس حصے کو جان بوجھ کر کیوں گل کیا ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کوئی نہیں تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا چرواہا خاندان کے ساتھ گہرا تعلق تھا اور یہ مقامی مصری یعنی قبطیوں کے دشمن تھے۔ اس لیے انہوں نے ان کا ذکر اپنی تاریخ میں گوارا نہیں کیا۔ مصری تو اس قدر متعصب تھے کہ

انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل تک کا ذکر اپنی تاریخ سے نکال دیا تھا۔

اس بابت، میں نے بائبل، تالمود، قرآن مجید اور اس دور کے کھنڈرات اور کتابوں کا مطالعہ کیا۔ مجھے قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام پر ایک تفصیلی سورت ملی۔ اس میں میرے لیے حیرت کا باعث یہ بات بنی کہ قرآن اس دور کے بادشاہ کو فرعون نہیں بلکہ ''ملک'' یعنی بادشاہ کہتا ہے۔ [یوسف: ۴۳، ۵۰] میرے لیے یہ بڑی دلچسپ بات تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ بائبل اور تالمود میں حضرت یوسف علیہ السلام کے دور کے بادشاہ کو بھی فرعون کہا گیا تھا اور اسی بات سے اس داستان نے جنم لیا جس کو سنانے کے لیے میں نے قلم اور کاغذ کا سہارا لیا ہے۔

جب میں نے اپنے ایک ساتھی پروفیسر ہائمن سے اس دلچسپ فرق کا ذکر کیا تو وہ تیکھے انداز میں مجھ سے کہنے لگا: ''تمہاری اس بات کا مطلب کیا ہے؟''

مجھے ہائمن کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ قرآن کو ہرگز الہامی کتاب نہیں مانتا۔ دراصل وہ ایک مسیحی تھا لیکن بعد میں دہریہ ہو گیا اور اب وہ تمام مذاہب کے خلاف سخت جذبات رکھتا ہے۔ میں نے اس کے جواب میں کہا: ''بھئی اس کا اس کے سوا کیا مطلب ہے کہ قرآن کا مصنف کوئی انسان نہیں ہو سکتا۔''

پروفیسر ہائمن غصے سے بولا: ''ہونہہ...... ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ، بھلا اس بات سے یہ نتیجہ کیسے نکلا؟ سیدھی سی بات ہے کہ محمد (ﷺ) بھی اسماعیلی تھے اور ان کے ہاں یہ روایت موجود رہی ہوگی کہ اسماعیلیوں نے مصر پر حکومت کی ہے۔ چنانچہ محمد (ﷺ) نے (نعوذ باللہ) اس معروف بات کے مطابق قرآن میں فرعون کے بجائے بادشاہ کا لفظ ڈال دیا۔''

میں نے فوراً جواب میں کہا: ''چلیں آپ کی یہ بات مان لیتے ہیں کہ عربوں کو معلوم تھا کہ اس وقت مصر میں بنی اسرائیل کی حکومت تھی۔ اس لیے قرآں اس وقت کے حکمران کو ''فرعون'' نہیں بادشاہ کہتا ہے، لیکن اس سے کم از کم یہ تو واضح ہو ہی جاتا ہے کہ قرآن تاریخ بیان کرتے ہوئے اپنی معلومات سے کام لیتا ہے نہ کہ بائبل اور یہودیوں کی روایات سے!'' میں نے ایک دوسرے پہلو سے بات کی۔ ہائمن کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا کیونکہ بائبل کے علماء چاہے وہ یہود ہوں یا مسیحی، قرآن پر اکثر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس میں بائبل سے معلومات لی گئیں ہیں، لیکن اب خود ہائمن کی اس بات سے یہ ثابت ہو رہا تھا کہ قرآن نے بائبل اور یہودی روایت کے برعکس مصر کے اس حکمران کو فرعون نہیں بلکہ بادشاہ کہا ہے۔ یہاں میں یہ وضاحت کر دوں کہ مصری اپنے خاندانی بادشاہ کو فرعون کہتے تھے، جیسے رومی اپنے بادشاہوں کو ''قیصر'' اور ایرانی اپنے حکمرانوں کو ''کسریٰ'' کہتے تھے۔

خیر ہائمن کی ہٹ دھرمی دیکھ کر مجھے غصہ آیا۔ میں نے کہا: ''پروفیسر ہائمن! آخر تم یہ کیوں نہیں مان لیتے کہ کم از کم اس موضوع پر قرآن کی بات بائبل اور تالمود سے بالکل مختلف بھی ہے اور درست بھی۔ اور یہ کہ قرآن بائبل اور تالمود سے اختلاف بھی کرتا ہے تو درست علم کی بنیاد پر کرتا ہے'' مگر ہائمن نے انتہائی بدتمیزی کے ساتھ گفتگو کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ تم خوامخواہ ایک چھوٹی سی بات سے قرآن کو ''ایک الہامی'' کتاب بنانے پر تل گئے ہو۔

مجھے اس کے رویے پر بہت دکھ ہوا اور میں نے کہا بدمزہ ہو کر مزید بات نہ کی۔ اس کے بعد میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ دیکھیں بھلا خود مسلمان قرآن کے اس شاندار فرق کو کیسے بیان کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے جب میں نے مختلف کتابوں کو دیکھا تو ایک اور انکشاف نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ یہ کہ قدیم مسلمان مفسرین اس فرق سے بالکل ناواقف ہیں؛ بلکہ بعض نے تو اس وقت کے مصری حکمران کو ''فرعون'' ہی کہا ہے۔ بعض کتابوں میں مجھے یہ بھی لکھا ملا کہ اس مصری حکمران کا نام 'ریان بن ولید' تھا لیکن محدثین اس روایت کو درست نہیں سمجھتے۔ اور دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اکثر مسیحی اور یہودی علماء نے قرآن کا (نعوذ باللہ) مذاق اڑایا ہے کہ اسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ مصر کے حکمرانوں کو بادشاہ نہیں فرعون کہتے ہیں اور بعض مسلمان علماء ان کی اس بات سے مرعوب ہو کر یہ کہتے ہیں کہ بادشاہ اور فرعون ہم معنی ہیں۔ البتہ چند جدید مفسرین جنہوں نے بائبل کی نئی تحقیقات کا بھی مطالعہ کیا ہے اور اس فرق سے ضرور واقف ہوں گے۔

میں نے اپنی ان معلومات پر ایک مسیحی عالم سے پوچھا کہ بائبل کی اس غلطی کا ان کے پاس کیا جواب ہے کہ وہ ایک غیر مصری حکمران کو ''فرعون'' کہتی ہے۔ فادر آگسٹس نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر کہا: ''ہاں واقعی یہ بائبل کا غلط ترجمہ ہے۔ اگر ہمارے پاس بائبل کے اس حصے کا اصل متن ہوتا تو غلطی نہیں ہوسکتی۔''

میں فادر آگسٹس کی اس حق گوئی پر بہت متاثر ہوا اور کہا: ''فادر آپ کو حیرت ہوگی کہ قرآن نے یہ غلطی نہیں کی۔ وہ موسیٰ علیہ السلام کے دور کے حکمران کو فرعون اور یوسف علیہ السلام کے دور کے حکمران کو بادشاہ (ملک) کہتا ہے۔

میری یہ بات سن کر فادر کا رنگ بدل گیا۔ وہ بالکل خاموش ہوگیا۔ پھر اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور بولا: ''حیرت انگیز! ناقابل یقین! اچھا میں خود دیکھوں گا۔''

اس گفتگو کے تیسرے روز جب میں یونیورسٹی میں اپنے آفس پہنچا تو میری میز پر ایک خط پڑا تھا۔ میں نے اسے کھولا۔ اس میں جو کچھ لکھا تھا میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ میرا خیال ہے اس عظیم یونیورسٹی میں اس سے پہلے اس طرح کی گھٹیا حرکت کسی نے نہیں کی ہوگی۔ دراصل مجھے ملنے والا خط ایک نوٹس تھا، ایک تنبیہی نوٹس۔ ہماری فیکلٹی کی انچارج نے مجھ پر الزام

لگایا تھا" پروفیسر جیمز! انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ ناپسندیدہ قسم کے مذہبی پروپیگنڈے میں ملوث ہیں۔ بائبل کے خلاف منافرت اور قرآن کے حق میں پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ موجودہ حالات (نائن الیون کے بعد) میں اس طرح کا رویہ کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اس طرح کی سرگرمیوں میں دوبارہ ملوث نہیں ہوں گے۔" یہ نوٹس پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے سوچا کہ اس قدر گھٹن کا ماحول تو شاید دنیا میں کسی جگہ نہ ہو۔ یہ خط ہماری سوسائٹی، ہمارے علمی ماحول، ہماری اقدار سب کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ تھا۔ چنانچہ میں غصے سے اٹھا سیدھا ڈین (جولیانہ آرم سٹرانگ) کے پاس جا پہنچا۔

وہ مجھے دیکھ کر سپاٹ لہجے میں بولی: "مسٹر ایڈم! آپ مجھے بتائیے کہ کیا اس وقت مسلمانوں نے دنیا کے امن کو تباہ و برباد نہیں کر دیا؟ کیا ان کی وجہ سے تمام غیر مسلم عدم تحفظ کا شکار نہیں ہو گئے؟ اس عالم میں اگر آپ ان کی مذہبی کتاب قرآن کو "الہامی" ثابت کرنے پر مہم شروع کر دیں تو یہ کہاں کی عقل مندی ہے؟"

میں نے جولیانہ کے متعلق یہ بات سن رکھی تھی کہ نائن الیون کے حادثے میں اس کا ایک بھائی ہلاک ہو گیا تھا اور اس کے بعد ظاہر ہے وہ مسلمانوں کی شدید دشمن ہو چکی تھی۔ لیکن وہ ایک خاص علمی سچائی کو خواہ مخواہ کا ایک ایشو بنا ڈالے گی، اس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

خیر میں نے غصے سے کہا: "مجھے آج معلوم ہوا ہے کہ ردِ عمل میں آدمی کا دماغ کس قدر خراب ہو جاتا ہے اور مجھے اس بات کا بھی اب کچھ احساس ہو رہا ہے کہ مسلمان ہم جیسے غیر مسلموں کے خلاف اتنی نفرت کیوں رکھتے ہیں۔" یہ جملے کہنے کے بعد میں نے کچھ لمحے توقف کیا اور پھر کہا: "میڈم اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ قرآن واقعی الہامی کتاب ہے تو پھر بھی ہمیں اس کی مخالفت کرنی چاہیے؟"

وہ فوراً بولی: "یہ تمہارا وہم [illegible] کتاب کے ماننے والے اس قدر تنگ نظر ہوں کہ اپنے خلاف [illegible] رکھنے والے کو قتل کرنا جائز سمجھتے ہوں وہ سچے کیسے ہو سکتے ہیں اور ان کی کتاب الہامی کیسے ہو سکتی ہے۔" جولیانہ! میں کم از کم آپ [illegible] اس طرح کی جاہلانہ بات کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ کیا بائبل میں بیسیوں جگہ یہ نہیں لکھا کہ اسرائیل کے دشمنوں کو ملیامیٹ کر دو۔ خدا کے دشمنوں کے خلاف جنگ کرو، خداوند تمہارے ساتھ ہوگا۔ اور تم یہ بات بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ ایسی باتیں قرآن اور بائبل ہی میں نہیں، قریباً قریباً دنیا کی تمام سرکردہ مذہبی کتابوں میں لکھی ہوئی مل جائیں گی!

میری بات کے جواب میں جولیانہ نے ایک اور جاہلانہ بات کی۔ بولی: "جیمز! بچے مت [illegible]

ہے کہ وہاں اس کا حکم صرف ان لوگوں سے متعلق ہے جو اس وقت اللہ کے پیغمبروں کے خلاف تھے اور ان کو ختم کر دینے کے درپے تھے۔''

واہ کیا انصاف کی بات کی آپ نے۔ بائبل اور دوسری کتابوں میں تو اس حکم کے مخاطب پیغمبروں کے دشمن ہیں، تو کیا قرآن میں اس حکم کے مخاطب اللہ کے دوست ہیں؟ کیا وہاں اس کے مخاطب اللہ کے دشمن نہیں ہو سکتے؟ کیا وہ حکم اس دور کے کافروں تک محدود نہیں ہوسکتا؟

میری زبان سے یہ جواب سن کر جولیانہ بالکل خاموش ہوگئی اور میں خود بھی حیران تھا کہ مسلمانوں پر ہونے والے سب سے بڑے اعتراض کا یہ جواب مجھے پہلے کیوں نہیں سوجھا تھا..... میں نے پہلے اس طرح کیوں نہ سوچا تھا..... شاید اس کی وجہ محض یہ تھی کہ اپنے حالیہ مطالعے کے دوران اتفاقاً میری نظر بائبل کے ایسے ہی احکامات پر پڑی تھی جس کا ذکر میں نے جولیانہ سے کیا تھا اور جب جولیانہ نے قرآن کے خلاف اعتراض کیا تو میرے ذہن میں اس کا جواب آ گیا۔

بہرکیف جب جولیانہ کو کوئی جواب نہ سوجھا تو وہ بولی: ''ٹھیک ہے مسٹر جیمز! اگر آپ کا یہی خیال ہے تو مجھے اس کا تحریری جواب دے دیں۔'' میں نے دل ہی میں جواب سوچ لیا تھا؛ لیکن اس وقت اسے دینا مناسب نہ سمجھا اور واپس آ گیا۔ اس ساری گرما گرمی میں ایک بات تو واقعی بڑی واضح تھی وہ یہ کہ میرے ذہن میں یہ بات بڑی شدت سے پیدا ہو چکی تھی کہ قرآن لگتا ہے کہ الہامی کتاب ہے۔ ایسا ہونا بڑا فطری تھا کیونکہ آپ جب کسی سچی بات کی بلاوجہ مخالفت دیکھتے ہیں تو اس کے متعلق ہمدردی ضرور پیدا ہوتی ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ جو کتاب تاریخ کے اس باریک سے باریک فرق سے واقف ہو وہ بھلا انسانی کلام کیسے ہوسکتا ہے؟ محمد ﷺ نے اس وقت نہ مصر میں جا کر کھنڈرات دیکھے تھے نہ اس دور کے کتبے دیکھے تھے اور نہ بائبل پر وہ تحقیق کی تھی جو آج میرے جیسے لوگوں کے سامنے ہے۔ اس لیے اگر اس وقت قرآن نے حکمران مصر کے لیے فرعون کے بجائے ''ملک'' لفظ استعمال کیا ہے تو اس کی اس کے سوا اور کیا وجہ ہے کہ قرآن واقعی کسی شخص کا کلام نہیں بلکہ ایک الہامی کتاب ہے۔ ایسا واقعی باریک سے باریک فرق کا خیال رکھنے والا ہے اور معمولی سے معمولی غلطی سے بھی پاک ہے۔ ایسا کلام واقعی اسی سے صادر ہوسکتا ہے، اسی کی شان کے مطابق ہے۔ اس سوچ کے ساتھ میں اپنے کمرے میں پہنچا تو ایک حیرانی میری منتظر تھی۔ فادر آگسٹس میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے: ''مسٹر جیمز! میں نے آپ کے بتائے ہوئے انکشافات پر غور بھی کیا اور ان کے متعلق پڑھا بھی ہے۔'' اس کا نتیجہ تو صرف ایک ہی ہے کہ قرآن واقعی الہامی کتاب ہے ... ایسی الہامی کتاب جو بالکل محفوظ ہے۔''